بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اِشارات

اس برصغیر پاک و ہند میں مسلمان قریب قریب سات سو برس تک حکمران رہے۔ ان حکمرانوں میں سبھی قسم کے لوگ شامل تھے۔ عابد و زاہد اور شب زندہ دار متقی بھی جنہوں نے اقتدار کے تخت پر متمکن ہونے کے باوجود بالکل فقیرانہ زندگی بسر کی اور وہ دنیادار بھی جو مادی فوائد و لذائذ جمع کرنے میں منہمک رہے جن کے وقت کا بیشتر حصہ عیش پرستیوں کے لیے وقف تھا۔ اسلام کے ساتھ لگاؤ اور وابستگی کے نقطۂ نظر سے ان سب کے مدارج میں فرق ہے۔ لیکن اس وسیع اختلاف کے باوجود ان سب میں ایک قدرِ مشترک یہ ضرور نظر آتی ہے کہ سوائے اکبر کے ان میں کوئی اسلام کا دشمن اور باغی نہ تھا۔ اپنے افعال و اعمال کے اعتبار سے وہ خواہ کسی مرتبہ اور مقام پر ہوں مگر ان میں سے کسی کے اندر یہ باطل خیال نہ پیدا ہوا تھا کہ جب تک دین کا قلع قمع نہیں کیا جاتا سلطنت کا استحکام ممکن نہیں۔ اُن میں بلا شبہ بعض بے عمل تو تھے مگر خدا اور رسول کے مقابلے میں سرکش نہ تھے۔

دینِ حق سے بغاوت کا جذبہ ایک منظم صورت میں جس بادشاہ کے دل میں پیدا ہوا وہ جلال الدین اکبر تھا۔ مسلمانوں کی صد سالہ تاریخ میں تنہا یہ فرمانروا تھا جس نے اسلام کو مملکت کی توسیع و ترقی کی راہ کا ایک سنگِ گراں سمجھا اور اُسے راستے سے ہٹانے کی بڑی منظم کوشش کی۔ اس نے ایک باطل تحریک کی بنیاد اٹھائی۔ اسے چلانے اور آگے بڑھانے کے لیے مختلف ذہین و فطین آدمیوں کو اپنے گرد جمع کیا۔ اور پھر حکومت کی پوری

قوت اور طاقت کے ساتھ اُسے کامیابی کے مراحل تک پہنچانے کی سعی کی۔

یہ تحریک کن حالات میں پیدا ہوئی، اس کے فکری اور نفسیاتی محرکات کیا تھے، پھر اسے کس انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے متعدد سوالات ایسے ہیں جو تاریخ کے طالب علم کے لیے بڑے ہی دلچسپ ہیں لیکن ہم اس وقت ان سب کو نظر انداز کر رہے ہیں اور صرف اس کے ایک گوشے سے بحث کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان صفحات میں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ دین کو ریاست کے آگے سرنگوں کرنے کا تصور کوئی نیا نہیں۔ خود اس ملک میں اکبر کے عہد میں اس مقصد کے حصول کے لیے بڑی سرتوڑ کوشش کی گئی لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ پھر اسی سلسلہ میں ہم اُن راستوں کی نشاندہی بھی کرنا چاہتے ہیں جن پر سے "ریاست پرستوں" کے یہ نام نہاد مسلمان قافلے گزر رہے تھے۔

ایک مفکر کا قول ہے کہ دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں۔ یہاں ماضی ہی استقبال کا بھیس بدل کر حال کے اسٹیج پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ چنانچہ آج بھی جو لوگ دین کو ملت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کا عزم رکھتے ہیں وہ انہیں منازل میں سے گزر رہے ہیں جن میں سے اکبر اور اُس کے رفقاء کار گزرے تھے۔ آپ اگر دینِ الٰہی کے علمبرداروں کے طرزِ استدلال کا تجزیہ کریں اور پھر "مفادِ ملت" کے پرستاروں کے دلائل کا جائزہ لیں تو آپ کو ان میں زمان و مکان کے اختلاف کے باوجود نفسیاتی اور اصولی مماثلت نظر آئے گی۔

اکبر، جسے نہایت پُرآشوب حالات میں تخت نشینی کا موقع ملا اُس نے اپنے دل میں یہ بات بٹھالی کہ اس ملک میں، جس میں بہت سی قومیں اور فرقے آباد ہیں ایک دین کی برتری تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ یہاں اگر کوئی مذہب کامیاب ہو سکتا ہے تو وہی ہے جو مختلف ادیان

اور مذاہب کا مرکب ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ اُس کا ذہن اس بات کی طرف بھی منتقل ہُوا کہ سلطنت کی ترقی اور اس کا استحکام اسی صورت میں ممکن ہے جب دین کو سلطنت کے مفاد کے تابع کر دیا جائے اور چونکہ سلطنت کے مفاد کی حفاظت اور پاسبانی کا کام سب سے بہتر طور پر بادشاہِ وقت ہی سرانجام دے سکتا ہے اس لیے دین کو بادشاہ کی خواہش کا پابند ہونا چاہیے بادشاہ دین کے جس جزو کو چاہے اختیار کرے اور جس کو چاہے ترک کر دے۔ اُس کی رائے ہر معاملہ میں آخری اور قطعی ہے اور کوئی قانون یا شریعت اس پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنے کا مجاز نہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے نمایاں چیز جو آغاز ہی میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ عہدِ اکبری کا مشہور و معروف محضر نامہ ہے جسے ملّا عبدالقادر بدایونی نے اپنی فاضلانہ تصنیف منتخب التواریخ میں حرف بحرف نقل کیا ہے۔ ہم اُس کا آخری حصہ درج کرتے ہیں:

اگر در مسائلِ دین کہ بین المجتہدین مختلف فیہا است۔ بذہنِ ثاقب و فکرِ صائب خود یک جانب را از اختلاف بہ جہت تسہیل معیشت بنی آدم و مصلحت انتظام عالم اختیار نمودہ بآں جانب حکم فرمایند متفق علیہ شود و اتباع آں بر عوام برعایا لازم و متحتم است اگر بموجب رائے صواب نمائے خود حکمے را از احکام قرار دہند کہ مخالف نصے نہ باشد و سبب ترفیہ عالمیاں بودہ باشد عمل براں نمودن بر ہمہ کس لازم و متحتم است و مخالف آں موجب سخطِ اخروی و	اگر (جلال الدین اکبر) ایسے دینی مسائل میں جن میں مجتہدین باہم اختلاف رکھتے ہوں اپنے رسا ذہن اور صائب رائے کی روشنی میں اولادِ آدم کی معاشی فلاح و بہبود اور دنیاوی انتظام و انصرام کی سہولتوں کے پیش نظر کسی ایک پہلو کو ترجیح دے کر اسی کو مسلک قرار دیں تو ایسی صورت میں بادشاہ کا یہ فیصلہ متفق علیہ اور قطعی سمجھا جائیگا اور عام مخلوق و رعایا کے لیے اس کی پابندی لازمی سمجھی جائے گی (اسی طرح) اگر کوئی بات جو قطعی نصوص کے مخالف نہ ہو اور دنیا والوں کو اس سے مدد ملتی ہو۔ بادشاہ اگر اُس کے

خسرانِ دینی و دنیوی است۔ ۔ متعلق کوئی حکم صادر فرمائیں تو اس کا ماننا اور اس پر عمل کرنا ہر شخص کے لیے ضروری اور لازمی ہوگا اور اس کی مخالفت دینی اور دنیوی بربادی اور اخروی مواخذہ کی مستوجب ہوگی۔

دینِ الٰہی کے اس محضر نامہ کو بلاشبہ اکبر کی موت کے بعد "اقتدار پرستی" کی کسی تحریک نے اپنے منشور میں من و عن داخل کرنا تو پسند نہ کیا لیکن اس قسم کی باطل تحریکات میں اس کی روح ہمیشہ کارفرما رہی۔ مسندِ اقتدار پر متمکن ہونے والوں اور اُن کے حاشیہ برداروں نے اسی محضر نامہ کو بنیادی فلسفہ کے طور پر اپنایا۔ ان سب نے استدلال کا یہی طریق اختیار کیا کہ بادشاہ یا فرمانروا گروہ کو چونکہ ملت اور قوم کا مفاد سب سے عزیز ہوتا ہے اور یہی لوگ اس کی بہترین طور پر حفاظت اور پاسبانی بھی کر سکتے ہیں اس لیے انہیں دین کے اندر ہر قسم کی کتر بیونت کا حق حاصل ہے۔ ملت کے معاشی اور سیاسی مفاد کے پیشِ نظر انہیں اس بات کا پورا پورا اختیار ہونا چاہیے کہ وہ دین کے جس جزو کو چاہیں ترک کر دیں اور جس جزو کو چاہیں اخذ کر لیں۔ پھر خواہ انہیں دین کا علم ہو یا نہ ہو وہ اس بات کے بھی پوری طرح مجاز ہیں کہ وقتی تقاضوں کے تحت اسلامی تعلیمات کی من مانی تعبیرات پیش کرتے رہیں اور ان کی یہ تعبیرات خواہ مزاجِ دین کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں، انہیں آخری اور قطعی مانا جائے، کیونکہ صحیح دین وہی ہے جو ان بااختیار لوگوں کے ذہن سے پیدا ہو اور برسرِ اقتدار گروہ کی زبان فیض ترجمان سے نکلے۔

یہ حضرات یوں تو دل و جان سے دین کے خیرخواہ اور خادم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کا خیال یہ ہے کہ دین کی جو صورت ہمیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچی ہے وہ صحیح نہیں اس لیے اس میں وقتاً فوقتاً تبدیلی کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ اور اگر یہ تبدیلی

نہ ہو تو دین کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ وہ زبان سے اس بات کو کہنے کی جرأت کریں یا نہ کریں لیکن اس طرزِ استدلال کا مطلب یہ ہے کہ معاذ اللہ خالق کو اپنی مخلوق کا مفاد خصوصاً معاشی، سیاسی اور معاشرتی مفاد مطلوب نہیں اور اس نے اپنے دین کا جو نقشہ نوعِ بشری کے سامنے پیش فرمایا ہے اس میں ان مفادات کو قطعاً ملحوظ نہیں رکھا اور یہ کام برسرِ اقتدار گروہ کے لیے چھوڑ دیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے حالات کے تقاضوں کے پیش نظر دین میں حک واضافہ کرتا رہے اور یہی اس کی سب سے بڑی دینی خدمت ہے۔ اگر مملکت کے شہریوں کا مفاد سود لینے، صوم وصلوٰۃ کی پابندی سے آزاد ہونے، کھیل تماشے اور ناچ گانے کو رواج دینے میں نظر آئے تو پھر مملکت کے سربراہوں کا فرض ہے کہ وہ بلا تأمل ایسی تدابیر اختیار کریں جن سے یہ سب مقاصد جلد از جلد حاصل ہو جائیں اور وہ اس سلسلہ میں جو فیصلہ بھی صادر فرمائیں وہی عین اسلام ہے کیونکہ اس فیصلے میں مملکت کی فلاح وبہبود کا راز مضمر ہے۔

اسی ضمن میں لطف کی بات یہ ہے کہ جس چیز کو یہ حضرات سلطنت کی فلاح وبہبود یا عوام کا مفاد کہتے ہیں وہ بھی بالکل اضافی چیزیں ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک فلاح وبہبود وہ ہے جسے ان کا فہم وادراک فلاح وبہبود سمجھے۔ یہ لوگ اگرچہ عقل کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں لیکن عقل سے ان کی مراد خود ان کا اپنا استدلال ہے۔ یہ خود جیسی بھی غیر عاقلانہ اور غیر دانشمندانہ باتیں کرتے رہیں وہ سب عقل کی باتیں ہیں اور اس وجہ سے ہر قسم کے فکری مغالطوں سے پاک۔ اور جنہیں یہ لوگ ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہوں وہ خواہ کتنی ہی دانشمندی کی باتیں ہوں وہ ان کی نظر میں "دلیلِ کم نظری" ہیں۔ وہ حضرات جنہوں نے مذہب کی تاریخ کا ذرا گہرائی میں اتر کر مطالعہ کیا ہے، اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ مذہب کے باغیوں نے جب بھی مذہب سے فرار کی راہ اختیار کی تو ہمیشہ عقل پرستی کا نعرہ لگایا۔ گویا ان کے نزدیک دنیا کا ہر مذہب اور دین صرف غیر عاقلانہ

تعلیمات، کا مجموعہ ہے۔ اس لیے انہوں نے ہمیشہ لوگوں سے یہی کہا: لوگو! تم زندگی کے ہر معاملہ کو فہم و فراست کی معتدل میزان پر تول کر دیکھو اور ہر چیز کا عقل و فکر کی روشنی میں جائزہ لو" مگر جس طرزِ فکر کو یہ حضرات بڑے طنطنے کے ساتھ عقلی استدلال کا نام دیتے ہیں اس کا مقصد صرف اُن کے ذاتی احساسات و جذبات اور اُن کی حسّی خواہشات اور تمناؤں کے لیے وجہ جواز فراہم کرنا ہے اور یہ عقل کے پرستار جو دن رات عقل کا وظیفہ پڑھتے رہتے ہیں اپنے بیشتر معاملات میں ایسی احمقانہ اور مضحکہ خیز باتیں کرتے ہیں جن سے خود عقل بھی ندامت سے اپنی گردن جھکا لیتی ہے۔ ذرا دیکھیے کہ عقل کے ان بڑے بڑے علمبرداروں نے کیسی کیسی حماقتیں کی ہیں۔ نماز، روزہ اور ایسی عبادات کو اسلام کے اندر جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اسلام کا پورا نظام انہیں بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ انہیں تو تقلیدات کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے لیکن ان کی جگہ گاؤ پرستی اور گوبر پرستی کو عین عقلی باتیں مان کر قبول کر لیا جاتا ہے۔

ملا عبدالقادر اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

نماز و روزہ و جمیع نبوات را تقلیدات نام نہادند یعنی غیر معقول و مدارِ دین عقل گزاشتند نہ نقل۔ (ص ۲۱۱)	نماز روزہ اور وہ ساری چیزیں جن کا تعلق نبوت سے ہے اُن کا نام تقلیدات رکھا گیا یعنی سب بے عقل کی باتیں ٹھہرائی گئیں اور مذہب (یعنی دین الٰہی) کی بنیاد نقل کی بجائے عقل پر رکھی گئی۔

جب کسی شرعی مسئلہ کا ذکر ہوتا تو اس وقت بادشاہ بڑے مغرورانہ انداز میں کہتا:

ایں را از ملایاں بہ پرسید و چیزے کہ تعلق بہ عقل و حکمت دارد از من۔ (ص ۳۰۸)	اس کو ملاؤں سے پوچھو، البتہ ایسی چیزیں جن کا تعلق عقل و حکمت سے ہو وہ مجھ سے دریافت کرو۔

عقلیت پرستی کے ان سورماؤں کا حال یہ تھا کہ ایک طرف تو وہ توحید، رسالت، نبوت، حشر و نشر، جنت، دوزخ، فرشتوں کے وجود کا محض اعتباری باتیں سمجھ کر بلا تکلف انکار کر رہے تھے

مگر دوسری طرف وہ انتہائی غیر عاقلانہ اور جاہلانہ باتیں قبول کرنے پر دل و جان سے آمادہ نظر آتے۔ ملا عبدالقادر فرماتے ہیں:

در ہر رکنے از ارکان و ہر عقیدہ از عقائد اسلامیہ چہ در اصول و چہ در فروع مثل نبوت و کلام و رویت و تکلیف و تکوین، و حشر و نشر شبہات گوناگوں بہ تمسخر و استہزاء آوردہ (ص ۲۰۷)

ارکان دین کے ہر رکن اور اسلامی عقائد کے ہر عقیدہ کے متعلق خواہ اُن کا تعلق اصول سے ہو یا فروع سے مثلاً نبوت، اللہ کا انبیاء سے ہم کلام ہونا، دیدارِ الٰہی، انسان کا مکلف ہونا، عالم کی تکوین، حشر و نشر وغیرہ کے متعلق تمسخر اور استہزاء کے ساتھ طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کیے جانے لگے۔

خود بادشاہ یہ "عظیم الشان خدمت" سرانجام دینے پر کمر بستہ تھا۔

خلق را بخلق قرآن و توغل در استحالہ وحی و تشکیک در نبوات و امامات امتحان کردند و لود جن و ملک و سائر مغیبات و معجزات و کرامات و انکار صریح آوردند و تواتر قرآن و ثبوت کلامیت آن و بقائے روح بعد از اضمحلال بدن و ثواب و عقاب را غیر از تناسخ محال می شمردند (ص ۲۷۳)

عام مخلوق کو بادشاہ، خلق قرآن کے مسئلہ کی تبلیغ کرتا اور وحی کے محال ہونے پر اصرار و غلو سے کام لیتا اور نبوت و امامت کے مسئلوں میں لوگوں کا امتحان لیتا اور جن، ملائک اسی طرح کی ان دیکھی حقیقتوں، نیز معجزات اور کرامات کا کھلے بندوں انکار کرتا۔ قرآن کے تواتر، خدا کے کلام کرنے، اور بدن کے فنا ہونے کے بعد روح کے بقا کو محال سمجھتا تھا۔ البتہ وہ یہ ضرور مانتا تھا کہ ثواب و عذاب تناسخ کی صورت میں ہوگا۔

ارکان دین کے ہر رکن کو اور اسلامی عقائد کے ہر جزو کا تو خلافِ عقل سمجھ کر مذاق اڑایا گیا۔ لیکن آفتاب پرستی، بلکہ آتش پرستی کو دینِ الٰہی میں معتقدات اور عبادات سمجھ کر بلا تامل شامل کر لیا گیا

کیونکہ یہ اکبر اور اُس کے رفقاءِ کار کی نظر میں عین عقلی باتیں تھیں۔ ملا صاحب لکھتے ہیں:

عبادت آفتاب را روزے چہار وقت کہ سحر و شام و نیم روز و نیم شب باشد لازم گرفتند، و ہزار و یک نام ہندی آفتاب را وظیفہ ساختہ نیم روز متوجہ آں شدہ بحضور دل مے خواندند و ہر دو گوش گرفتہ و چرخ زدہ مشت ہا بناگوش کوفتہ حرکاتے دیگر نیز ازیں قبیل بسیار بود، و قشقہ کشیدند و نوبت و نقارہ یکے در نیم شب و یکے در وقت طلوع قرار یافت

(بادشاہ) دن میں چار مرتبہ یعنی صبح و شام دوپہر آدھی رات لازمی طور پر آفتاب کی عبادت کرتا۔ اور آفتاب کے ایک ہزار ایک ہندی ناموں کا وظیفہ پڑھتا۔ ٹھیک دوپہر کو آفتاب کی طرف حضورِ قلب کے ساتھ ان ناموں کو دہراتا اپنے دو کانوں کو پکڑ کر ایک چرخ کھاتا اور کانوں کے لو پر مکے مارتا اور اسی طرح کی بہت سی دوسری حرکات کرتا وہ قشقہ لگاتا اور آدھی رات کو ایک مرتبہ، پھر طلوع آفتاب کے وقت دوسری مرتبہ روزانہ نقارہ بجواتا۔

معاملہ صرف آفتاب پرستی تک ہی محدود نہ تھا۔ انسان جب خدا پرستی کا راستہ ترک کر دیتا ہے تو پھر ذلت کی کوئی حد نہیں ہوتی جہاں اُس کے قدم جا کر رُک جائیں۔ پھر وہ ہر قسم کی گمراہی میں مبتلا ہوتا چلا جاتا ہے:

ہم چنیں آتش و آب و سنگ و درخت و سائر مظاہر روزگار تا گاؤ و سرگیں آں نیز، قشقہ و زنار را جلوہ داد و دعائے تسخیر آفتاب کہ ہندواں تعلیم دادہ بودند بہ طریق ورد در نیم شب و وقت طلوع خواندن گرفتند

(ص۲۶۱)

بالکل اسی طرح آگ، پانی، درخت اور اسی طرح کے تمام مظاہرِ قدرت حتیٰ کہ گائے اور اس کے گوبر کے سامنے بھی جبینِ نیاز جھکاتا تھا۔ وہ قشقہ لگاتا، گلے میں جینو ڈالتا اور آفتاب کو مسخر کرنے کی دعا جو ہندوؤں نے اسے سکھائی تھی وِرد کے طور پر نیم شب اور طلوع آفتاب کے وقت پڑھا کرتا تھا۔

به سوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

الحاد و زندقہ کی اس باطل تحریک کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ عقلیت کے نعرہ کے ساتھ ساتھ دورِ جدید کے عقل پرستوں کی طرح اکبر اور اُس کے حاشیہ نشینوں نے بھی سب سے پہلے نبوت سے گلو خلاصی کرانے کی کوشش کی۔ اُن کے رسا ذہن فوراً اس "خطرے" کو بھانپ گئے کہ دین کے اندر تحریفات کی راہ میں اگر کوئی چیز مزاحم ہو سکتی ہے تو وہ سنتِ نبوی ہے اس لیے جب تک وہ اس سے نجات حاصل نہیں کر لیتے اُن کا راستہ ہموار نہیں ہو سکتا۔ سنت کے ذریعہ ہی کلامِ پاک کا مفہوم متعین ہوتا ہے، یہی اس کی عملی تعبیر ہے۔ اور اسی کی مدد سے ہم قرآن مجید اور اس کے مطالب و معانی کو صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ پھر یہی وہ ایک ایسا مستند اور قابلِ اعتماد ریکارڈ ہے جس کو دیکھ کر ہم فوراً یہ جان لیتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کے منشا کو اس آب و گل کی دنیا میں بالفعل کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے۔ اسلام جو دنیا میں ایک صالح معاشرہ اور ایک مثالی سوسائٹی قائم کرنے کا حکم دیتا ہے اُس کا عملی نقشہ بھی سنت ہی فراہم کرتی ہے۔ اس بنا پر سنتِ نبوی ایک مسلمان کے لیے تاریخ، قصہ پارینہ یا زیبِ داستان نہیں بلکہ اُس کے دین کا ایک لازمی جزو ہے۔ جس طرح اللہ کے اقرار کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار بھی صاحبِ ایمان ہونے کیلیے ضروری ہے بالکل اسی قرآن مجید کے ساتھ سنت رسول کا تسلیم کرنا بھی دین کا بنیادی تقاضا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مسلمانوں کو جو یہ حکم دیا گیا ہے کہ مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا تو یہ کوئی عارضی اور وقتی تجویز نہ تھی بلکہ یہ ایک ایسا حکم ہے جس سے قیامت تک کوئی مسلمان، مسلمان رہتے ہوئے انکار نہیں کر سکتا۔ اکبر اور اُس کے ساتھیوں نے حضور کے معاملے میں جو روش اختیار کی اُس کا اندازہ ذیل کے اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے۔

نام احمد و محمد مصطفےٰ و امثال آں
بہ جہت کافران بیرونی و زنان اندرونی
گراں می آمد تا بمرور ایام اسامی چند را از مقربان
کہ بایں نام مسمی بودند تغیر دادہ مثلاً یار محمد
محمد خان را رحمت می خواندند و می نوشتند۔
(ص ۲۱۵)

احمد و محمد مصطفیٰ وغیرہ نام کافروں اور محل کی
غیر مسلم رانیوں کی خوشنودی کی خاطر اس شخص (اکبر)
پر گراں گذرنے لگے۔ آخر کچھ دنوں کے بعد اپنے
خاص لوگوں کے نام اس نے بدل بھی ڈالے
مثلاً یار محمد اور محمد خاں کو وہ رحمت ہی کے
نام سے پکارتا تھا اور لکھنے کے وقت بھی انہیں
ناموں سے مخاطب کرتا۔

بادشاہ کا یہ انداز فکر دیکھ کر علماء سوء نے بھی اپنی روش فوراً تبدیل کر دی اور اپنی تصنیفات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنے کا مروجہ طریقہ ترک کر دیا۔[1]

[1] ایسا اوقات بالکل معمولی اور غیر رسمی باتیں دلی کیفیات اور قلبی واردات کی زیادہ بہتر شارح اور ترجمان ثابت ہوتی ہیں۔ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبوت کے اقرار کے یہ معنی ہیں کہ اب مرکز عقیدت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کی بجائے وہ انسان ہے جس کو نبی تسلیم کیا جا رہا ہے۔ وہی اب اپنے ماننے والوں کے لیے معیار حق و باطل ہے اور اسی کے افکار و اعمال اب ان کے لیے سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر اسی کے لیے ان کے دلوں میں محبت و احترام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ آپ اگر قادیانی لٹریچر کا جائزہ لیں تو آپ کو اس چیز کا بیّن ثبوت ملیگا۔ ہمارے سامنے اس وقت الفضل مورخہ ۲۸ اپریل ۱۹۶۰ء کا پرچہ ہے۔ اس پرچے کے صفحہ ۲ پر مدیر صاحب نے ادارتی نوٹ میں حضور سرور کائنات ؐ کے اسوۂ حسنہ سے بحث کی ہے۔ عنوان سے لیکر مقالہ کے اختتام تک حضور سرور دو عالم کا ذکر قریب قریب دس مرتبہ آیا ہے لیکن مدیر نے ہر جگہ "آنحضرت صلعم" ہی لکھا ہے۔ انہیں کہیں ایک مقام پر بھی اس بات کی توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ وہ حضور ؐ کے مبارک نام کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بھی رقم فرمائیں۔ افضل الانبیاء و ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں تو اس قدر اختصار پسندی کا مظاہرہ کیا گیا ہے لیکن حضور سرور کائنات کے مقابلے میں جہاں جہاں مرزا غلام احمد قادیانی کا ذکر آیا ہے وہاں ہر مقام پہ سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الفاظ ملتے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ حضور سرور کائنات سے زیادہ تعظیم تو مرزا ناصر احمد کے معاملے میں دکھائی گئی ہے۔

علماء سوء در تصنیفات از خطبۂ تبرامی آوردند و اکتفا به توحید کردند و القاب پادشاہی می نوشتند و مجال نہ بود کہ نام آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم علی الرغم المکذبین بہ برند (ص ۲۶۹)

علماء سُوء اپنی تالیفات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے سے احتراز کرتے اور وہ معاملہ کو صرف توحید اور بادشاہی القاب تک محدود رکھتے اُن بیچاروں کی مجال نہ تھیں کہ وہ مکذبین کے علی الرغم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا اسم مبارک زبان اور قلم پر لائیں۔

حضورؐ سرورِ کائنات کے بعد دین میں سب سے بلند ترین مرتبہ حضورؐ کے رفقائے کار کا ہے۔ یہ وہ خوش نصیب انسان تھے، جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضانِ صحبت سے فائدہ اٹھانے کا پورا پورا موقع ملا۔ ان کے ایثار اور بے نفسی کی خود اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں شہادت دی ہے۔ ان نفوسِ قدسی کے متعلق اکبر اپنے دل میں جو احساسات رکھتا تھا ان کے متعلق ملا عبدالقادر لکھتے ہیں:

و آنچہ در حق صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم در وقت خواندن کتب سیر مذکور می ساختند خصوصاً در خلافت خلفائے ثلثہ و قضیۂ فدک و جنگ صفین غیرہ آں کہ گوش از استماع آں کر باد خود بزبان نتواں آورد۔

سیر کی کتب پڑھتے ہوتے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق بادشاہ کی زبان سے جو الفاظ نکلتے تھے خصوصاً خلفائے ثلاثہ، فدک، جنگ صفین وغیرہ کے ذکر کے وقت جو کچھ کہا جاتا کان اگر انہیں سننے کی سکت نہ رکھتے تو بہتر تھا وہ الفاظ اتنے نازیبا ہیں کہ میں انہیں اپنی زبان سے ادا کرنے کا حوصلہ نہیں پاتا۔

اکبر نے یہ افسوسناک طرزِ عمل صرف حضور سرورِ کائنات کے جلیل القدر رفقاء کے متعلق ہی

اختیار نہ کیا بلکہ اُس نے عقلیت پرستوں کی عام روش کے مطابق ماضی کی ہر بڑی شخصیت اور اسلاف کے سارے علمی اور تحقیقاتی کارناموں سے سخت بیزاری کا اظہار کیا۔ اس کے نزدیک اسلاف معاذ اللہ سارے کے سارے جاہل، اَن پڑھ، تنگ نظر اور متعصّب تھے۔ اُن کے جو جی میں آیا اُسے اسلام کا نام دیکر مقدّس بنا دیا۔ اس بنا پر اُن کے افکار و نظریات محض جہالت کی باتیں ہیں جنہیں دورِ جدید کی روشنی میں کبھی بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اسی کی صراحت میں ملا عبد القادر فرماتے ہیں:

ملّتِ اسلام ہمہ نا معقول و حادث واضع آں فقراء عرباں بودند کہ جملہ مفسداں وقطاع الطریق اند، و آں دو بیت شاہنامہ کہ فردوسی طوسی بہ طریق نقل آوردہ متمسک می ساختند[1] (ص ۳۵۷)

ملّتِ اسلامی کا سارا علمی سرمایہ من گھڑت باتوں اور غیر عاقلانہ افکار کا مجموعہ ٹھہرایا گیا اور اسے مرتب کرنے والے عرب کے وہ چند مفلس اور قلاش بدو قرار پائے جن میں سب کے سب مفسد اور راہزن تھے ۔۔ اور شاہنامہ فردوسی کے دو شعروں سے سند پکڑی گئی۔

پھر امت کے بڑے بڑے نامور ائمہ اور صلحاء کے متعلق جس قسم کے ناموزوں الفاظ استعمال کیے جاتے وہ بھی ایک بیمار ذہن کی کھلی ترجمانی کرتے ہیں۔ ملا صاحب لکھتے ہیں:

اگر در حین بحث سخن مجتہدین را می آوردند

اگر کسی بحث و مباحثہ کے درمیان ائمہ مجتہدین

---

[1] قارئین کے لیے شاید یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ دورِ جدید کے متجددین فردوسی کی بجائے انگریزی شعراء سے سند پکڑتے ہیں۔ عائلی کمیشن کی رپورٹ میں اسلاف کے سارے اجتہادات بلکہ پورے معاشرتی نظام کو ٹینی سن (TENNYSON) کے ایک شعر کی سند سے رد کر دیا گیا ہے۔ ٹینی سن صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ ہر پرانا نظام نئے نظام کے لیے جگہ خالی کر کے تبدیل ہو جاتا ہے اور خدا اپنے آپ کو بیشمار شکلوں میں ظاہر فرماتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ایک عمدہ سے عمدہ نظام بھی دنیا کو تباہ کر کے رکھ دے۔

می گفت فلاں حلوائی، فلاں کفش دوز و فلاں چرم گر بر ما حجت می آرید۔

(آمد صفحہ ۲۰)

کی بات پیش کی جاتی تو ابوالفضل اس کے جواب میں بڑے مغرورانہ انداز سے کہتا کیا تم فلاں حلوائی اور فلاں کفش دوز اور فلاں چرم ساز کے قول سے مجھ پر حجت قائم کرنا چاہتے ہو۔

جب اندازِ فکر میں کسی حد تک ہم آہنگی ہو تو قدرتی طور پر فکری تحقیق کے نتائج بھی قریب قریب ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ دیکھیے کہ اکبر اور اس کے رفقائے کار نے بھی دین کے انہیں حصوں کا مذاق اڑایا ہے جن کا آج عقلیت پرست اڑا رہے ہیں۔ مثلاً دین الٰہی کے حامیوں کو یہ چیز ناممکن نظر آتی تھی کہ ایک شخص بھاری جسم رکھنے کے باوجود یکایک نیند سے آسمانوں تک چلا جائے، خدا سے باتیں کرے اور پھر زمین تک صحیح سلامت واپس آجائے۔ اسی طرح حضور سرورِ دو عالم کی حیاتِ طیبہ کے بعض معروف و مستند واقعات کا بھی سرے سے انکار کر دیا گیا۔ اُن کے ذہن یہ باور کرنے پر کبھی آمادہ ہی نہ ہوتے تھے کہ حضور سرورِ کائنات نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو سولہ سال سے کم مدت میں اپنی زوجیت میں قبول فرمایا۔

معاملہ صرف فکر و تحقیق تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اس نئے فلسفہ کے مطابق مختلف غیر اسلامی قوانین بھی مرتب ہوئے اور پھر انہیں بالجبر نافذ کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔ ان قوانین کا زیادہ حصہ نکاح، تعدد ازواج، پردہ، زنا اور شراب سے متعلق تھا۔

نکاح کے متعلق یہ حکم صادر ہوا کہ کوئی لڑکا جس کی عمر سولہ سال سے کم ہو اور کوئی لڑکی جس کی عمر ۱۴ سال سے کم ہو اپنے آپ کو رشتۂ مناکحت میں باندھ نہیں سکتی۔ اسی طرح تعدد ازواج کو بھی ممنوع قرار دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ "بیشتر از یک زن نکاح نہ کنند" اور اس کے لیے دلیل یہ پیش کی گئی کہ "خدا یکے و زن یکے"؛ پھر نکاح کے خواہش مند لڑکے اور لڑکیوں پر یہ پابندی

لہ یہ قانون عوام کے لیے ہی تھا خود بادشاہ اور اُس کے مصاحبین اس قانون سے مستثنیٰ تھے۔

بھی عائد کی گئی کہ وہ نکاح سے پہلے معائنہ کرائیں اور کوتوالی سے عمر کا تصدیق نامہ حاصل کریں اس کے بغیر وہ نکاح نہیں کر سکتے۔

اسی طرح عورتوں کو اس بات کا پورا پورا اختیار دیا گیا کہ وہ گلی کوچوں میں کھلے چہروں کے ساتھ چلیں پھریں اور اس معاملہ میں ان پر کسی قسم کی کوئی سختی نہ کی جائے۔ جن عورتوں نے پردہ کو خیرباد کہا اُن کی باقاعدہ حکومت کی طرف سے پذیرائی کی گئی اور ان کی اس خدمتِ جلیلہ کا قصر ایوان میں نہایت اچھے الفاظ میں اعتراف ہوا۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں اُس عقلی تحریک کا خاکہ جو حکومت کے استحکام اور رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے اس "برِعظیم" میں پوری قوت کے ساتھ اٹھائی گئی تھی۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ تحریک جسے حکومت کے پورے اسباب و وسائل میسّر تھے، جس کو چلانے والوں میں اُس عہد کے سب سے زیادہ ذہین و فطین آدمی شامل تھے اور جو خود تمام ادیان کے "صالح اجزا" سے مرکب تھی۔ وہ آخر بادشاہ کے چند مصاحبین سے آگے کیوں نہ بڑھ سکی۔ اور ان مصاحبین کے اخلاص کا یہ بھی عالم تھا کہ جس دن بادشاہ نے آنکھیں بند کیں، اسی روز اس تحریک کے بہت سے حامیوں نے اسے ترک کر دیا۔ جن لوگوں کو ساتھ ملانے کے لیے اکبر نے گاؤ پرستی تک کو اختیار کیا تھا انہوں نے اس کی خدمات کا صلہ یہ ادا کیا کہ اسے قبر میں بھی آرام اور چین نہ لینے دیا۔ اس کی ہڈیوں کو کھود کر باہر پھینک دیا۔ پھر اس تحریک کی قوت اور طاقت کا یہ عالم تھا کہ ایک مردِ حق آگاہ نے جس کے پاس نہ تو کوئی مادّی طاقت تھی اور نہ ہی دنیاوی اقتدار، جو ہر قسم کے ساز و سامان سے خالی ہاتھ تھا اُس نے تن تنہا محض اللہ کے بھروسہ پر اس سے ٹکر لی اور عوام میں تو کیا بلکہ خود محلّات کے اندر بھی اسے پنپنے کا موقع نہ دیا اور یہ عقلی تحریک خود اپنی کمین گاہ کے اندر بھی سر نہ اٹھا سکی۔

اکبر کا یہ تجربہ اور اس کا یہ افسوسناک انجام ایک مسلمان کے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ امت مسلمہ کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اسلام کے اندر اس قسم کی جتنی تحریکات اٹھیں ان سب کا قریب قریب یہی حشر ہوا اور آئندہ بھی اگر اسی نوع کے احمقانہ تجربات جاری رکھے گئے تو ان سے بھی اسی قسم کے حسرتناک نتائج برآمد ہوں گے۔ دنیا کا کونسا اسلامی ملک ہے جس میں تھوڑے بہت تغیر و تبدل کے بعد اس قسم کی "عقلیت پرستانہ" تحریکیں نہیں اٹھائی گئیں۔ کونسی ایسی سرزمین ہے جس میں ملک و ملت کے نام پر صنم خانے آباد نہیں کیے گئے۔ آج سے چند سال پیشتر ترکی میں یہی تجربہ ہوا۔ اور دورِ جدید میں دنیا کے ہر اس حصے میں جہاں مسلمانوں کو سیاسی آزادی نصیب ہوئی ہے وہاں اس کو دہرایا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر ملک میں حالات و واقعات اور ماحول کے فرق کی وجہ سے اس تحریک میں مناسب تبدیلیاں ہوتی رہیں لیکن جن عقلی اور فکری عناصر سے اس کا خمیر اٹھایا گیا ہے وہ ہر جگہ ایک جیسے ہیں۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ یہ تحریک اختلاف کے باوجود ایک ہی انجام سے دوچار ہوتی ہے۔ یہ صورتِ حال ہم سے گہرے غور و فکر کا مطالبہ کرتی ہے۔ اسے ہم محض مسلمان کی قدامت پرستی اور جہالت کہہ کر ٹال نہیں سکتے۔ بار بار کی چوٹیں کھانے کے بعد اب ہمیں آنکھیں کھول کر اپنے ان تجربات کا جائزہ لینا چاہیے تاکہ آئندہ کے لیے ہم کوئی صحیح راہِ عمل اختیار کر سکیں۔

آئندہ شمارے میں انشاء اللہ ہم اسی موضوع پر بحث کریں گے۔